Oriental College Magazine, Vol.99, No. 04, Serial No. 374, 2024

علم المعانی، معنیات اور سیمیات؛ معاصر تنقید کے لوازم

محمد راشد سعیدی، پی ایچ ڈی
لیکچرار اُردو
شعبہ اُردو، دی اسلامیہ یونی ورسٹی آف بہاول پور

ILM-UL-MA'ANI, SEMANTICS AND SEMIOTICS;
THE ESSENTIALS OF CONTEMPORARY CRITICISM

Muhammad Rashid Saeedi, PhD
Lecturer in Urdu
Department of Urdu, The Islamia University of Bahawalpur

Abstract

Contemporary criticism has evolved beyond mere classification, evaluation, and value determination, and is now recognized as a philosophical process of understanding and interpretation. The critic’s role is to trace the process of semantic dissemination within a creative text and to convey all possible meanings to the readers. To interpret and derive meanings from literary texts, it is essential for critics to possess linguistic, particularly semantic, awareness. Both Eastern and Western traditions have developed various disciplines related to meaning that engage with the meanings present in texts on multiple levels. The awareness of concepts such as singular and fixed meanings versus ambiguous, multifaceted, continuously changing, and deferred meanings enables the interpreter or commentator to extract plausible and reasonable interpretations. Different disciplines related to meaning exhibit varying approaches to meaning and the process of meaning-making. This paper will review three such disciplines—rhetoric (علم المعانی), semantics (معنیات), and semiotics (سیمیات)—to explore their relationship with meaning, the multiplicity of meaning, and the process of meaning-making.

Keywords:
Ilm-ul-Ma’ani, Semantics, Semiotics, Interpretation, Criticism, Polysemy, Ambiguity.

بیسویں صدی کے نصف اوّل تک فن پارے کے حسن و قبح اور تعینِ قدر ہی کو ادبی تنقید کا بنیادی سروکار سمجھا جاتا تھا نیز ادق شعری متون کی شرح کو بھی ایک حد تک تنقید کے دائرے میں شمار کیا جاتا تھا، تاہم معاصر تنقید ادبی متون کی تفہیم و تعبیر، ان میں معنی خیزی کے نظام تک رسائی اور تخلیقی عمل کی گرہ کشائی کو بھی اپنا دائرہ عمل ثابت کر چکی ہے۔ کسی بھی تحریر کو ادب کے دائرہ میں داخل ہونے کے لیے مناسب، مزیّن اور فصیح الفاظ کے تخلیقی برتاؤ کا حامل ہونا پڑتا ہے، لیکن ادب کو زندگی سے اپنی جُرأت مضبوط کرنے اور ادبِ عالیہ میں مناسب درجہ پانے کے لیے بامعنی، بلکہ تہہ دار معنی کا حامل ہونا ضروری ہے۔ اس لیے فی زمانہ، بالعموم نظری و اطلاقی تنقید کا مرکز و محور معنی، کثرتِ معنی اور معنی پاشی کا نظام نظر آتا ہے۔ مابعد جدید عہد کے باشعور شاعر اور فکشن نگار شعوری سطح پر ایسا متن تخلیق کر رہے ہیں جو سطحی اور یک رُخانہ ہو، بلکہ کثیر المعنویت کا حامل ہو۔ ایسا تخلیقی متن جو بدلتے زمانے اور سماج کے ساتھ اپنی اہمیت کھو نہ دے بلکہ اس کے اندر موجود فکری پرتیں وقت کے ساتھ کھُلتی رہیں اور وہ تادیر بامعنی (Relevant) رہے۔ تخلیقی متون میں موجود تہہ داری ہی تنقید کو یہ جواز فراہم کرتی ہے کہ ان متون کی نو بہ نو شرح و تعبیر کی جائے۔ ایک متن کی متنوع شرح و تعبیر جہاں اسی متن میں موجود علائق کی بنیاد پر ہوتی ہے وہیں معاصر تنقید کو ثروت مند بنانے والے کئی ایسے سیاسی، سماجی، سائنسی اور بالخصوص لسانی نظریات اور حربے (Tools) موجود ہیں جنھیں سیاق اور تناظر کے طور پر برت کر کثرتِ معانی کا حصول ممکن ہو پاتا ہے۔

ادبی متون کی تعبیر کرنے اور ان میں سے معانی اخذ کرنے کے لیے معبر یا شارح کے لیے لسانی، بالخصوص معنیاتی شعور کا حامل ہونا لازم ہے۔ لسانیات کے عہد بہ عہد بدلتے نظریات سے معنی کے تصور میں بڑی تبدیلیاں آئی ہیں۔ واحد اور متعین معنی سے مبہم، کثیر، مسلسل متغیر اور ملتوی معنی کے تصورات کا شعور ہی معبر یا شارح کو قرینِ قیاس اور معقول معنی اخذ کرنے کے قابل بناتا ہے۔ معنی سے متعلق مختلف علوم کے معنی اور معنی خیزی سے متعلق رویے بھی الگ ہیں۔ ذیل میں معنی سے متعلق تین علوم علم المعانی، معنیات اور سیمیات کا اس طرح جائزہ لیا جائے گا کہ مذکورہ علوم کا معنی، کثرتِ معنی اور معنی خیزی سے تعلق اور طریق آئینہ ہو سکے۔

علم المعانی مشرق بنیاد علم ہے جس کی جڑیں عربی زبان میں پیوست ہیں تاہم فارسی اور اردو میں بھی اس کی روایت بہت مضبوط ہے۔ بالخصوص مذہبی علوم سے متعلق مدارس میں علمِ معانی تاحال داخلِ نصاب ہے اور اسے باریک بینی سے، جزئیات سمیت، سبقاً سبقاً پڑھایا جاتا ہے۔ جب کہ

معنیات(Semantics) لسانیات کی وہ شاخ ہے جس میں معنی کی تشکیل، تغیر اور اثرات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔(۱) اسی طرح سیمیات (Semiotics) کی اکہری تعریف کریں تو یہ دراصل زبان میں موجود نشان کی تعبیر کا علم ہے۔(۲) یہ مذکورہ دونوں علوم کی نسبت جدید علم ہے جس کی بنیادیں سوسئیر کے تصورِ لسان سے اٹھی ہیں تاہم، پس ساختیات، بیانیات اور دیگر معاصر نظریات نے اسے کئی طرح سے متمول کر دیا ہے اور معاصر تنقیدی اور تعبیری منظر نامے میں اس کا اطلاق اہم ہے اور عام بھی۔

تاریخی تقدیم کے پیشِ نظر علم المعانی کی توضیح پہلے کی جاتی ہے تا کہ معنی سے متعلق تصورات کا ارتقاء بھی پیشِ نظر رہے۔ علمِ معنی و بیان اور ایسے دیگر علوم کے متعلق ہمارے ناقدین اور ماہرینِ لسانیات میں ایک عمومی رویہ رہا کہ وہ ہر قدیم اور مشرقی چیز کو روایتی اور پیش پا افتادہ سمجھ کر اس سے صرفِ نظر کر دیتے ہیں اور اس سے متعلق غلط فہمیوں کا شکار رہتے ہیں۔ غلط فہمیاں پیدا ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم ان کے پس منظر کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یعنی اگر ہم معاصر ادب و تنقید کی تفہیم کی کوشش کرتے ہیں تو معاصر نفسیاتی و فلسفیانہ نظریات کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہیں تاہم جب علم معانی و بیان ایسے علوم کا تذکرہ آتا ہے تو ہم اسے بھی معاصر نظریات کے پیشِ نظر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، حالانکہ ہمیں اس نظام کو بطور سیاق سمجھنا چاہیے جو ان علوم سے براہ راست جڑا ہوا ہے اور جس کا تعلق نو افلاطونی فلسفے اور مذہب سے گہرا ہے۔

''علم المعانی'' کی ترکیب اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ یہ ایک منفرد، جدا اور خود مکتفی علم ہے، تاہم ریاض احمد معنی خیزی اور معنی آفرینی سے متعلق علم کے لیے ''علم معانی و بیان'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں جو مزید چار علوم پر مشتمل ہے:

۱۔ علم عروض و قافیہ و ردیف ۲۔ علمِ معانی ۳۔ علمِ بیان، تشبیہ، استعارہ ۴ علمِ بدیع(۳)

جامع اللغات کے مطابق علمِ معانی، علمِ بیان اور علمِ بدیع دراصل علمِ بلاغت کی شاخیں ہیں۔

> ''خوش گفتاری، شیریں کلامی، خوش بیانی، فصاحت، بلوغ، پختگی، ایک علم جو اعلیٰ قسم کی خوش گفتاری سکھاتا ہے۔ اس کی تین شاخیں ہیں، یعنی علمِ معانی، علمِ بیان اور علمِ بدیع۔''(۴)

تاہم صاحبِ مراۃ الشعر عبد الرحمٰن کے نزدیک بلاغت فقط کلام کی خوبصورتی اور خوش گفتاری کا علم ہے نہیں بلکہ بلاغت سے مراد بلاغۃ المعنی ہے؛ یعنی معنی کا جوں کا توں ادا کرنا، دل کی بات پوری پوری سامع کے دل تک پہنچا دینا، تاکہ کلام کا جو اثر ہونا چاہیے وہ پورا پورا ہو۔(۵) بلاغت کی مکمل تفہیم اور

اس کا معنی خیزی سے تعلق واضح کرنے کے لیے اسی سے منسلک ایک اصطلاح فصاحت کی بھی صراحت ضروری ہے۔ فصاحت سے مراد کسی کلام میں موقع محل کی مناسبت سے الفاظ کا برتاؤ ہے۔ یعنی کلام میں ایسے الفاظ لانا جو روزمرہ اور محاورے کے خلاف نہ ہوں اور ان کے استعمال میں ضعفِ تالیف، تعقیدِ لفظی ومعنوی اور تنافرِ لفظی و معنوی ایسے عیوب نہ پائے جائیں۔(۶) یعنی بلاغت معنیٔ مقصود کو جوں کا توں پہنچانے کا علم ہے۔ اسی طرح جو کلام فصیح ہو گا وہ بلیغ بھی ہو گا جب کہ بلیغ کلام کے لیے فصیح ہونا لازمی نہیں۔ لفظ اور کلمہ کے لیے بھی فصاحت کے مدارج مختلف ہیں۔ کچھ الفاظ فصیح ہوتے ہیں اور کچھ فصیح تر، لیکن کلمہ یا کلام کی بلاغت کے لیے فقط الفاظ کا فصیح ہونا کافی نہیں بلکہ الفاظ کی ترتیب، ترکیب، ہیئت اور برتاؤ سب مل کر طے کرتے ہیں کہ کلام کس قدر بلاغت کا حامل ہے۔ کلام کا فصیح یا غیر فصیح ہونا جانچنے کے لیے علمِ لغت، علم صرف اور علمِ نحو پر عبور ہونا ضروری ہے۔ علمِ لغت سے لفظ کے فصیح یا غریب ہونے کا اندازہ ہو گا، اسی طرح علمِ صرف سے پتا چلے گا کہ لفظ کا استعمال قیاسِ لغوی کے مطابق ہے یا مخالف، جب کہ علمِ نحو سے ضعفِ تالیف اور تعقیدِ لفظی کی کیفیت روشن ہو پائے گی۔ تاہم ان علوم سے یہ نہیں پتہ چلے گا کہ مقصود معنی کے اظہار میں خطا تو سرزد نہیں ہوئی یا کہیں تعقیدِ معنوی تو نہیں در آئی، لہٰذا معنی مقصود کے اظہار میں خطاؤں سے بچنے کے لیے علمِ معانی ایجاد کیا گیا اور تعقیدِ معنوی پر گرفت کرنے کے لیے علمِ بیان۔(۷)

مولوی سید مہدی الزماں کے نزدیک کسی بھی سخن ور یا سخن فہم کے لیے بلاغت کے دونوں علوم یعنی علمِ بیان اور علمِ معانی سے واقفیت ضروری ہے کیونکہ ان کے نزدیک علمِ بیان سے وہ ملکہ پیدا ہوتا ہے کہ متکلم اپنے مطلب اور مقصد کو کئی طریقوں سے بیان کر پائے اور علمِ معانی وہ استعداد پیدا کرتا ہے جو کلام کو موافقِ ضرورت ادا کرنے میں غلطی اور خطا سے محفوظ رکھے۔(۸) یعنی علمِ معانی سے مصنف کے ارادہ کو قائم رکھنا ہی مقصود ہے۔ مصنف یا شاعر جب اپنے کلام میں کسی بھی نوعیت کے موضوع یعنی مدح، ذم، اظہار عشق یا تعریفِ حسن وغیرہ کرنے کا ارادہ باندھتا ہے تو علمِ معانی کا یہ فرض بن جاتا ہے کہ کلام میں الفاظ کا انتخاب اور برتاؤ اپنے معنوں کے لحاظ سے اس طرح کیا جائے کہ متن سے معنی کی کثرت کی بجائے ایک ہی متعین معنی کا اظہار ہو۔ ڈاکٹر مزمل حسین فصاحت و بلاغت کی غرض و غایت کی بابت یوں رقم طراز ہیں:

> "فصاحت اور بلاغت کو باہم ملانے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کلام میں فصاحت وبلاغت کی بدولت ایسے الفاظ کا انتخاب کیا جاتا ہے جو بولنے سننے اور لکھنے میں اچھے لگیں اور

اہلِ زبان کی بول چال اور فطرت کے عین مطابق ہوں۔ یہ مفہوم اور معنی کے اعتبار سے
اس طرح واضح ہوں کہ ان کے ذریعے اصل معنی تک رسائی ہو سکے۔"(۹)

فصاحت و بلاغت کا مقصد "اصل معنی" تک رسائی کی کوشش قرار دینے سے ایک نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ مصنف کی بنیادی کوشش کثرتِ معنی کی بجائے معنی کو متعین اور مخصوص کرنا ہوتا ہے، یعنی منشائے مصنف ہی کا ابلاغ قاری تک ہو پائے تاکہ متن معنی خیزی میں آزاد ہو پائے۔ تاہم اس نکتے کی مکمل تفہیم کے لیے علمِ معانی کی وضاحت ضروری ہے۔ مولانا حکیم عبدالحمید تحسین بدایونی اپنی تصنیف فصاحت و بلاغت میں علمِ معانی کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ یہ وہ علم ہے جس میں لفظ کے مقتضائے حال کے مطابق ہونے کے احوال پہچانے جاتے ہیں۔ یعنی ایک شخص دوسرے سے کوئی خطاب کرے اور اگلا اس کے خطاب سے انکار کرے تو اس کا انکار حال ہے۔ یہ انکار جو مقتضیٰ تاکید کا ہے، تاکید اس کا مقتضیٰ ہے۔ ان احوال کی معرفت کے لیے آٹھ چیزوں کا احوال جاننا لازم قرار دیا گیا ہے۔ باب اوّل اسناد خبری کے احوال میں، باب دوم مسند الیہ کے احوال میں، باب سوم مسند کے احوال میں، باب چہارم متعلقاتِ فعل کے احوال میں، باب پنجم قصر کے احوال میں، باب ششم انشا کے احوال میں، باب ہفتم فصل اور وصل کے احوال میں، باب ہشتم ایجاز (اختصار)، اطناب (طوالت) اور مساوات کے احوال میں۔(۱۰)

صاحب بحر الفصاحت نے درج بالا ابواب کے حوالے سے مکمل تفصیلات دی ہیں یعنی ایک کلام یا جملے میں الفاظ کی ترتیب کیا ہو گی؛ یہ علمِ نحو سے متعلق ہے، الفاظ کی نوعیت کی ہو گی؛ یہ علمِ صرف سے متعلق ہے، جب کہ ہر دو طرح سے معنی خیزی پر کیا منفی و مثبت اثر پڑا اور کیوں پڑا؟ نیز فہمِ معنی میں کون سی کڑیاں جوڑ کر دیکھنا پڑیں گی؟ یہ سب علمِ معنی کی حدود میں شامل ہے۔ ماہرِ علمِ نحو کسی کلام میں سقم کی نشاندہی کرے گا جب کہ ماہرِ علم المعانی اس سقم کے پیچھے موجود وجوہ کی نشان دہی کرے گا۔ تاہم درج بالا ابواب کا استعمال اس وقت ہو گا جب کلام مقتضائے ظاہر کے مطابق ہو گا۔ یعنی ابتداً یہ جاننا لازم ہے کہ کلام مقتضائے ظاہر کے مطابق ہے یا خلاف۔ مثال کے طور پر ایک شخص کسی بچے کو اس کے باپ کی نافرمانی کرتا دیکھ کر اسے مخاطب کرے: "اے نوجوان یہ تمہارا باپ ہے۔" تو مقتضائے ظاہر تو یہ ہے کہ بچے کو پتا ہے کہ اس کا باپ کون ہے، وہ اس بات کا معترف بھی ہے۔ جب کہ بات بچے کو بتانا کہ یہ شخص جس کی تم نافرمانی کر رہے ہو تمہارا باپ ہے، دراصل مقتضائے ظاہر کے خلاف ہے۔ یعنی بچے کو منکر کے درجے میں اتار کر اسے کہا جا رہا ہے کہ یہ تمہارا باپ ہے۔ تو یہ بتانا کہ یہاں کلام کو اس طرح کیوں برتا گیا ہے اس کی غرض و غایت کیا ہے، علم المعانی کا کام ہے۔

ایک شخص کسی کتاب کا مطالعہ کر رہا ہے اور وہ کہتا ہے: ''میں کتاب پڑھ رہا ہوں۔''، تو اپنے معنی اور غرض کے مطابق کلام لانا ''مساوات'' ہے اور بالفرض کسی وجہ سے اسی بات کو کرنے کے لیے کم الفاظ لائے جائیں تو اسے ''ایجاز'' کہیں گے اور زیادہ الفاظ لائے جائیں تو یہ ''اطناب'' کے زمرے میں آئے گا۔ اگرچہ اس کی بھی کئی صورتیں ہیں تاہم یہیں سے وہ امکانات نظر آتے ہیں جہاں کثیر المعنویت کے در وا ہوتے ہیں۔ جب ایک استاد گھر سے نکل کر کلاس میں پہنچتا ہے تو یہی بتاتا ہے: ''میں آج صبح گھر سے کلاس میں آیا۔'' حالانکہ گھر سے نکل کر شاید اسے کئی گلیوں، چوراہوں اور شاہراہوں سے ہو کر آنا پڑا ہو، لیکن اس نے یہ سب بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی کیونکہ یہ سب عموماً سب کو معلوم ہوتا ہے۔ تاہم سمجھنے کا نکتہ یہ ہے کہ کلام کرنے یا لکھنے والے نے یہاں سامع یا قاری پر اکتفا کیا۔ یعنی مکمل بات سمجھنے کے لیے اس نے قاری پر انحصار کیا۔ جب مصنف یا متن ہی فہمِ معنی کے لیے قاری پر انحصار کریں تو ابہام یا کثرتِ معنی کا امکان پیدا ہو جاتا ہے، کیونکہ زیرِ غور مثال میں تو عقلِ عامہ (Common Sense) کی بنیاد پر بات مختصر کی گئی ہے لیکن بہت سی جگہوں پر قرینے پیچیدہ بھی ہوتے ہیں جہاں قاری یا سامع اپنی ذہنی بساط کے مطابق ہی معنی اخذ کرتا ہے۔

درج بالا مثال میں ایجاز و اختصار کی بنیاد پر ابہام یا کثرتِ معنی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اسی کے ساتھ ایک اور واضح اشارہ علمِ معنی میں ''مطلق'' اور ''مقید'' کے اصول کے تحت بھی ملتا ہے۔ کسی بھی لفظ کا مطلق معنی وہ معنی ہے جو عمومی طور پر رائج ہو اور اسے عوامی قبولیت بھی حاصل ہو، حالانکہ ضروری نہیں کہ اس کا صرف وہی معنی ہو، اس کی مختلف اقسام اور نوعیتیں بھی اس کے معانی بڑھا سکتی ہیں۔ اس لیے جب ان مختلف معانی کا بیان مقصود ہو تو انہیں مقید کیا جاتا ہے۔ تاہم کئی مواقع پر مقید کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی لیکن استعمال میں مطلق معنی سے گریز کیا جاتا ہے، یہاں بھی اختلافِ فہم کی بنیاد پر ابہام اور کثرتِ معنی کا در آنا لازم ہے۔ مثال کے طور پر جب کوئی شخص کسی دکان سے موبائل یا کپڑا لینے جاتا ہے تو انھیں ان کے مطلق معنوں میں استعمال کرتے ہوئے ان کے نام یعنی موبائل یا کپڑا کہہ کر ہی طلب کرتا، تاہم گھر آکر جب وہ ان اشیا میں نقص دیکھتا ہے تو واپس کرنے جاتا ہے اور دکان دار بھی بالعموم چیز بدل دیتا ہے، یہ پوچھے بغیر کہ آپ نے تو صرف موبائل / کپڑا کہا تھا، صحیح موبائل / کپڑا نہیں کہا تھا۔ بات یہ ہے کہ جب ان اشیا کو مطلق معنوں میں استعمال کرتے ہیں تو ان سے چیز کی اصلی حالت ہی مراد ہوتی، یعنی پھل سے مراد اچھا اور صاف پھل، کپڑا سے مراد بغیر نقص والا کپڑا اور موبائل سے مراد صحیح سالم اور بغیر نقص والا موبائل۔ تاہم استعمال کے قرینے، سامع / قاری کی ذہنیت اسے کئی اور معانی بھی پہنا سکتی ہے۔ اس کی مزید وضاحت کے

لیے مذہب سے متعلق ایک مثال ملاحظہ کیجیے: بدعت کے معنی، اختراع، نئی چیز یا بات کے ہیں جب کہ اصطلاحی معنوں میں دینی معاملات میں کوئی نئی بات نکالنا جو پہلے سے موجود نہ ہو یعنی قرآن و سنت میں اس کا ذکر موجود نہ ہو(۱۱)، جس کے لیے ناپسندیدگی کا بھی اظہار کیا گیا۔ اب چونکہ فطری ارتقائی عمل سے گزرنے کے بعد انسانیت اس نہج پر پہنچ چکی ہے کہ معاملات زیست کو قدیم طریقوں کے مطابق چلانا ممکن نہیں تو کئی نئی چیزوں کا دینی معاملات میں بھی چلن عام ہو گیا ہے، جس کے بنیاد پر بدعت کی بھی دو اقسام طے کر دی گئیں؛ بدعتِ حسنہ اور بدعتِ سیّئہ۔ بدعتِ حسنہ؛ یعنی ایسی نئی بات جس میں اچھائی کا پہلو مضمر ہے جب کہ بدعتِ سیّئہ جس میں ناپسندیدہ اور شعائرِ اسلام سے متصادم چیزوں کو رکھا جاتا ہے۔ اب اسی تقسیم اور نوعیت کو طے کرنے کے طریقہ کار نے ایسے منفی نوعیت کے ابہام اور کثرتِ معنی کو جنم دیتا ہے جس کے متشدد نتائج سماج کو بھوگنا پڑ رہے ہیں۔

قدیم عربی زبان و ادب میں لفظ کو معنی پر فوقیت دی جاتی تھی اور رعایتِ لفظی پر معنی آفرینی کی ترجیح کو ناپسند کی جاتا تھا۔ ایک عجمی بنیاد عربی شاعر بشار بن برد نے معنی کو لفظ پر فوقیت دی اور لفظی رعایت اور اختراعی معنی یعنی شعر میں کثیر المعنویت کو فروغ دیا، جسے بعد ازاں اسی کی تقلید شروع ہوئی اور متاخرین نے اسے عروج بخشا۔ اس نکتے کی وجہ سمجھنے کے لیے قدیم عربی شاعری میں تصورِ معنی پر نظر ڈالنی چاہیے۔ صاحبِ مراۃ الشعر کے مطابق زمانۂ جاہلیت میں معانی سے مراد حقائقِ واقعی، جذباتِ فطری یا وہ خیالات مراد لیے جاتے تھے جو نسبتاً حقیقت سے قریب تر ہوں۔ اس نوعیت کے معانی کو اگر معنی کی قسم اوّل تسلیم کریں تو تخیل کی خلاقی اور فکر کی ترکیب و ترتیب سے وجود میں آنے والے معنی، جو بظاہر حقیقت سے قریب تر نظر نہ آتے تھے، اہلِ عرب کے نزدیک پسندیدہ نا تھے، تاہم بشار بن برد کے افکار فروغ پانے کے بعد ان کا رواج پڑ گیا(۱۲) اس کی بنیاد کو دیکھیں تو یہاں اہلِ عرب کا سادہ طرزِ زندگی اور پیچیدہ اور رنگارنگ تہذیبی مظاہر سے دوری تھی، جن سے اہل عجم مالامال تھے، اسی لیے ان کے ہاں تخیل کی کارفرمائی اور اور معنوی بوقلمونی زیادہ نظر آتی ہے۔ تاہم عرب ہوں یا عجم زبان کے فطری برتاؤ اور تفاعل سے انکار ممکن نہیں، ابہام اور کثرتِ معانی زبان کی فطرت میں ہے، جس سے شعوری طور فروغ تو دیا کا سکتا ہے لیکن اسے مکمل طور پر ختم نہیں جا سکتا۔

معاصر ادبی تنقید کی بات کی جائے تو سبھی جانتے ہیں کہ اب یہ تنقید تعین قدر سے زیادہ شرح و تعبیرِ متن کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔ تنقید اور ناقدین سے یہ توقع ہر گز نہیں کی جاتی کہ وہ ماہرینِ علم المعانی

بھی ہوں، لیکن نقاد یا ناقدین کا وہ طبقہ جو تعبیر کی کثرت اور معنی کے التوا کو پسند نہیں کرتا اور کسی بھی متن میں سے ابھرے اور متعین معنی ہی کو حقیقی اور بنیادی معنی تصور کرتا ہے، کیا وہ شرح اور تعینِ معنی کے عمل میں علم المعنی کو برتنا لازم سمجھتا ہو گا؟ اگر نہیں تو معاصر لسانی و ادبی نظریات اور علم المعانی کو بروئے کار لائے بغیر کون سی علمی و ادبی بنیادیں اسے تنقید و تعبیر کا جواز مہیا کرتی ہوں گی؟

اب معنیات (Semantics) کا معنیاتی معنی اور کثرتِ معنی کے حوالے سے رویّہ جاننے سے قبل اس کی حدود اور تفاعل سے واقف ہونا لازم ہے۔ معنیات کا علم لسانیات ہی کے ذیل میں آتا ہے۔ یہ دراصل معنی کا معروضی مطالعہ ہے۔ معنیات کا واسطہ ابہام، کثرتِ معنی اور معنی کے تمام سلسلوں سے براہِ راست پڑتا ہے۔ لسانیات کے علاوہ دیگر علوم بالخصوص فلسفہ اور منطق نے معنیات کی اہمیت بڑھا دی۔ فلسفہ میں معنی اور اس کی تحدید کا عمل بہت زیادہ ہے کیونکہ ان میں معنی کے تمام پہلو منطقی اصولوں کے مطابق برتے جاتے ہیں، اس لیے فلسفہ ہی کے ذیل میں معنیات کی علمی تشکیل ہو پائی۔(۱۳) لفظ ہو، سائن، سگنل یا کوئی علامت کوئی بھی معروض جس میں سے معنی برآمد ہو سکتا ہے، وہ معنیات کے احاطے میں آئے گا۔ معنیات لفظ، نشان، معنی، مترادف، متضاد اور ان سب کی منطقی کارکردگی کا احاطہ کرتی ہے نیز کسی معنیاتی معروض کی حد بندیوں کا تعین بھی اسی کا کام ہے۔

لسانیات کی قدرے اہم شاخ ہونے کے باوجود بیسویں صدی کے اوائل تک اس پر توجہ نہیں دی جاتی تھی، حتیٰ کہ اسے لسانیات کا حصہ بھی نہیں سمجھا جاتا تھا، پھر کچھ عرصہ بعد اس کی طرف توجہ ہوئی تو قواعد کو اس میں شامل نہ کیا۔ پھر لیونارڈ بلوم فیلڈ [Leonard Bloodfield] نے معنیات اور ذخیرہ الفاظ کو بھی شامل کر لیا گیا۔ تاہم جب نوم چومسکی [Noam Chomsky] ایسے ماہرینِ لسانیات نے جب اسے اپنے قواعد میں شامل کیا تو معنیات کو اس کی اہمیت ملنے لگی۔ صاحبِ کشاف اصطلاحاتِ لسانیات معنیات کی بابت رقم طراز ہیں:

> "لسانیات کا وہ شعبہ جو معانی پر بحث کرتا ہے یعنی جو حوالے اور محول کے تعلق کو زیرِ غور لاتا ہے اور ان محولات (الفاظ یا لسانی علامات) کے معانی کی تاریخ اور ان میں آنے والی تبدیلیوں کا تجزیہ کرتا ہے۔"(۱۴)

درج بالا تعریف میں معنیات اور تاریخی لسانیات کی حدود کو آپس میں خلط ملط کر دیا گیا ہے۔ تاریخی لسانیات میں لفظ سے پیدا ہونے والے معنوی تغیرات کی نوعیت کا مطالعہ کیا جاتا تھا جب کہ جدید

معنیات پیدا ہونے والے معانی ان کی تحدید اور وجوہ سے بھی بحث کرتی ہے۔ معنیات کا براہِ راست تعلق معنی کی ترسیل و ابلاغ سے بھی ہے۔ معنی کے ترسیل و ابلاغ کی بات کی جائے تو یہی بات کثیر جہت اور وسعت کی حامل ہو جاتی ہے۔ معنی خیزی علم و ادب بلکہ ہر فکری ڈسپلن کے اندر مختلف انداز سے وقوع پذیر ہوتی ہے۔ اگر ادب ہی کی بات کی جائے، جو کہ کسی خاص سماج اور اس کے اندر تشکیل پائی گئی زبان میں خلق ہوتا ہے، اپنے اظہار کے لیے یک رُخی اور سطحی زبان کی بجائے بیان و بدیع سے مزین زبان کا حامل ہوتا ہے۔ اس میں معنی خیزی کا عمل سادہ اور اکہرا نہیں ہوتا، اس لیے تفہیم ادب کا عمل سنجیدہ اور سلسلہ وار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اشرف کمال معنیات کو ایک سائنس قرار دیتے ہیں جو اشیا اور ان کے لیے مختص کی گئی علامات کا آپسی تعلق جانچ کر ان کی حقیقت تک رسائی کی کوشش کرتی ہے۔ نیز معنیات کسی بھی متن کے جملوں اور لفظوں کا مطالعہ اس طور بھی کرتی ہے کہ ان کا باہمی تعلق اور اس تعلق سے ظہور پذیر ہونے والے معانی تک رسائی حاصل ہو۔(۱۵)

کسی بھی زبان میں ابلاغ کے لیے بنیادی طور پر تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے جو دراصل معنیات ہی کی ذیل میں آتے ہیں۔ الف: اس زبان کے لفظوں یعنی مارفیم کا علم۔ ب: اس زبان کی جملوں یعنی نحوی ساخت کا علم۔ ج: اس زبان یا زیرِ غور جملے کے سیاق اور تناظر سے واقفیت۔ تناظر اور سیاق کا تعلق پریگ میٹکس (Pragmatics) سے ہے جس کا ترجمہ ڈاکٹر رؤف پاریکھ نے تداولیات کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ لفظی معنوں کا مطالعہ معنیات ہے اور چھپے ہوئے معنوں کا مطالعہ تداولیات ہے۔(۱۶)۔ چھپے ہوئے معنوں سے مراد، دراصل کسی بھی جملے کے وہ معانی ہیں جو اس کے سیاق و سباق اور تناظر کے واضح ہونے کے بعد سامنے آتے ہیں۔ پیٹرک گرفتھ[Patrick grifh]اس کی بابت کچھ یوں رقم طراز ہیں:

> "Pragmatics is about the interaction of semantic knowledge with our knowledge of the world, taking into account the contexts of use." (17)

اس نکتے کی وضاحت کے لیے ایک جملہ مثال کے طور پر دیکھتے ہیں:" میں نہیں پہنچ پاؤں گا۔" دیکھا جائے تو اس جملے کا معنی وہی ہے جو بظاہر نظر آرہا ہے کہ یعنی کسی متعین مقام پر نہ پہنچ پانے کا اظہار۔ لیکن ذرا غور کریں تو اسی جملے سے منسلک کچھ اور معانی بھی سامنے آجائیں گے۔ جیسے؛ جہاں تم لوگ پہنچ چکے ہو میں وہاں نہیں پہنچ پاؤں گا۔ میں نے کوشش کی ہے لیکن میرا پہنچنا ممکن نہیں ہے وغیرہ۔ یعنی سیاق و سباق اور تناظر کے واضح ہوئے بغیر مکمل ابلاغ نہیں ہو سکتا، جو کہ تداولیات سے ہے اور جسے معنیات سے الگ کر

کے نہیں دیکھا جاسکتا۔

کیٹی ویلز [Katie Wales] نے معنیات کو درج ذیل چار حصوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ لغوی معنیات(Lexical Semantics)   ۲۔ نحوی معنیات(Sentense Semantics)

۳۔ بیانیہ معنیات(Narrative Semantics)   ۴۔ ادبی معنیات(Literary Semantics) (۱۸)

جب کہ وکٹوریا فرامکن[Victoria Fromkin] کے نزدیک معنیات کے تین ہی بنیادی اور اہم ترین حصے ہیں: ۱۔ لغوی معنیات(Lexical Semantics) ۲۔ نحوی معنیات(Sentential Semantics) ۳۔ مرکباتی معنیات(Phrasal Semantics) (۱۹)

لغوی معنیات سے مراد فقط الفاظ کے معنی کا اندراج نہیں بلکہ لفظ کے تمام ممکنہ معنوں؛ حقیقی و استعاراتی، کا تحلیلی تجزیہ کرنا ہے۔ اسی کی ذیل ہی میں لفظی سطح پر ابہام کی صورتوں کو پرکھنا بھی شامل ہے جس سے عوام میں الجھن پیدا ہوتی ہے۔ نحوی معنیات میں جملے کی ان نوعیتوں اور خاصیتوں کو پرکھنے کا کام کیا جاتا ہے جس سے جملے کی سطح پر کثرتِ معنی پیدا ہوتی ہے۔ بیانیہ معنیات میں فکشن اور فلسفے میں بیانیہ کی سطح پر معنیاتی تغیرات کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ادبی معنیات میں فقط ادبی متون کی ادبیت اور معنیاتی نظام کو فلسفہ، نفسیات اور تھیوری کی سطح پر پرکھا جاتا ہے۔ بحیثیت مجموعی معنیات کسی بھی متن (بالخصوص ادبی) کی قرأت کے دوران اس میں موجود ہمہ قسم کے معانی کی گرہ کشائی کرتا ہے اور اس کی تمام پنہائیوں اور عقدوں کو وا کرتا ہے اور اسی طرح قاری کی مدد سے متن میں مضمر معانی کی دریافت کی ذمہ داری پوری کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

لفظ یا نشان کے معنی پر غور کرنے سے قبل لفظ و معنی کے رشتے پر غور کرنا لازم ہے۔ کسی لفظ کے جو بھی معنی ہوتے ہیں، کیوں ہوتے ہیں اور ان کے پیچھے کون سی منطق کارفرما ہوتی ہے، اس کا تسلی بخش جواب آگے سیمیات کے ذیل میں آئے گا، تاہم یہاں چند اشارے کیے جاتے ہیں۔ ساختیات اور سیمیات کے بانی فرڈی نینڈ ڈی سوسیئر نے زبان کو نشانات کا علم قرار دے کر لفظ اور معنی کے رشتے کو من مانا اور الل ٹپ(Orbitrary) ثابت کیا تھا۔ یعنی کسی بھی لفظ، نشان یا مارفیم اور اس کے معنی کے درمیان کوئی لازمی اور منطقی تعلق نہیں ہوتا بلکہ من مانا ہوتا ہے جو وقت کے ساتھ رواج پا کر اس سماج اور زبان کا بنیادی جزو بن جاتا ہے اور اسے بدلنا فردِ واحد کے بس سے باہر ہو جاتا ہے، یعنی لفظ اور معنی کا رشتہ من مانا ہونے کے باوجود متفق الیہ ہے۔ تاہم ایک صورت ایسی موجود ہے جس میں کسی لفظ اور اس کے معنی کے درمیان عقلی و نطقی ربط ہو

سکتا ہے؛ جیسے کسی آواز اور اس کو سن کے ذہن میں آنے والے خیال کے درمیان رشتہ۔ جیسے ہاہاہا، میاؤں، دھڑام اور سر سر کی آوازیں سننے کے بعد ہر جگہ اور ہمیشہ ایک سا مفہوم ہی ذہن میں آتا ہے؛ اس امر کو صوتی علامتیت (Sound Symbolism) کہتے ہیں۔(۲۰) کچھ لوگوں کے نزدیک لفظوں اور کے معانی کا وجود میں آنا اسی آواز اور خیال کی طرز ہو گا لیکن اکثر ماہرین لسان اس کو تسلیم نہیں کرتے کہ کہ مختلف خطوں میں ایک ہی طرح کی آوازوں کو مختلف الفاظ کی صورت میں لکھا جاتا ہے، اس کے علاوہ آواز کے علاوہ دیگر اشیا سے منسلک الفاظ پر یہ اصول صادر نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح سوسیئر کا من مانے رشتے کا اصول ہی قرینِ قیاس لگتا ہے۔ تاہم ڈاکٹر گیان چند کے نزدیک تہذیب کی ابتدا میں لفظ و معنی کا رشتہ الل ٹپ اور من مانا ہو گا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ متفق الیہ ہو گیا ہے۔ اب کسی بھی زبان کا بولنے والا فطری اور لاشعوری طور پر الفاظ کو ان کے معانی سمیت ہی سیکھتا ہے۔(۲۱)

کسی بھی زبان میں معنی کی ترسیل میں لفظوں کی کلی اہمیت تسلیم کرنے سے قبل جملے کی نحوی ساخت سے واقفیت بھی لازم ہے۔ لفظ واقعتاً معنی کا کیریئر ہوتے ہیں، معنی کا بوجھ اُٹھاتے ہیں لیکن نحوی ساخت کے الٹ پھیر سے ان کی کارکردگی غارت ہو جاتی ہے۔ لفظ اسی وقت ہی معنی کی ترسیل ممکن کر پاتے ہیں جب تک انھیں مناسب نحوی ساخت میسر ہو۔ یہاں نوم چومسکی کا معروف جملہ درج کرنا ضروری ہے جس سے یہ امر واضح ہو جائے گا۔ ''بے رنگ سبز افکار زور و شور سے سوتے ہیں۔'' اس جملے میں ہر لفظ با معنی ہے لیکن انھیں جس ترتیب سے برتا گیا ہے وہ سب کو بے معنی کر دیتا ہے۔ یہاں لفظ کی معنیاتی اہمیت تو کم نہیں ہوتی تاہم نحوی نظام کی خود مختاری ثابت ہو جاتی ہے۔(۲۲)

یہاں مقالے کا بنیادی سروکار چونکہ معنیات کے تنقیدی تفاعل یعنی متن کی شرح و تعبیر، معنی کی کثرت اور اس کی وجوہ سے ہے تو کثرتِ معنی کی بنیادوں پر غور کرنے کے لیے معنیات کے ذیل میں معنیاتی خاصیتوں، ترادف اور تجنیس کو سمجھنا لازم ہے۔ معنیاتی خاصیتیں (Semantic properties) کسی بھی لفظ کا وہ بنیادی مفہوم ہوتا ہے جو اس کے معنوی ابلاغ میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر لفظ ''لڑکا'' سن یا پڑھ کر تین بنیادی مفاہیم کا سمجھ جانا لازم ہے؛ ''لڑکا'' انسان ہے، مذکر ہے اور کم عمر ہے۔ یہ مفاہیم اس لفظ کی معنیاتی خاصیتیں ہیں۔ جب کوئی تخلیق کار کسی لفظ کو تخلیقی سطح پر برت رہا ہوتا ہے تو وہ ان خاصیتوں میں سے کسی ایک ہی کو فوقیت دیتا ہے، جب کہ قاری کے لیے ضروری نہیں کہ وہ اپنی پہلی قرأت میں اسی ایک مفہوم کو پیش رکھ کر متن کی تفہیم کرے، اسی لیے اس مقام پر معنی کی کثرت تفہیم کی کثرت

کی طرف لے جاتی ہے۔ ترادف اور مترادفات (Synonymy) کسی بھی لفظ کے ہم معنی کے طور پر برتے جانے والے الفاظ ہوتے ہیں۔ جیسے رنج، غم اور دکھ کو ایک دوسرے کے مترادفات کے طور پر درج کیا جاتا ہے حالانکہ ان کا برتاؤ اور محلِ استعمال ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

تجنیس (Homonymy) وہ کیفیت ہے جس میں ایک ہی ہجا اور تلفظ رکھنے والے الفاظ سے سابقہ پڑتا ہے۔ یہ ایک ہی زبان سے مختلف المعانی الفاظ بھی ہو سکتے ہیں اور مختلف زبانوں سے متعلق بھی۔ کسی تخلیقی متن میں ان کا استعمال فکری سطح پر ابہام پیدا کر دیتا ہے۔ معنیات میں کثرتِ معنی (polysemy) اور اس کی وجوہ اور مظاہر کو لغوی سطح پر پرکھا جاتا ہے۔ یعنی کثرتِ معنی کے حامل الفاظ یکساں قواعدی زمروں سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ہی لفظ مختلف قواعدی زمروں سے تعلق رکھتا ہو مثلاً بیک وقت اسم اور فعل ہوتے ہوئے کئی معانی رکھتا ہو۔ جیسے لفظ "جوڑا" ہر چیز کے جفت کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے، نرمادہ کے طور پر بھی، مکمل پوشاک کے معنوں میں کپڑے کے تھان یا پارچہ کے طور پر بھی۔(۲۳) جب شعری متن میں شعوری سطح ایسے الفاظ کو برتا جاتا ہے تو معنی سیال بن کر کثرتِ تعبیر کے در وا کرتا ہے۔

شرح و تعبیر، معنی خیزی اور اس کے نظام تک رسائی کا عمل ہی معاصر تنقید کا بنیادی وظیفہ تک قرار پا چکا ہے، اب نقاد کے لیے لازم ہے کہ تنقیدی تناظرات کے ساتھ معنی سے متعلق علوم تک رسائی اور ان پر گرفت بھی رکھتا ہو۔ کیونکہ معنیات اور معنی سے جڑے دیگر علوم ہی متن کی معروضی تعبیر کا جواز فراہم کرتے ہیں۔

اب بات کرتے ہیں سیمیات کی۔ سوسئیر کے نظریات سے بنیاد پانے والا نشانات کا علم جسے یورپ میں Semiology اور امریکہ میں Semiotics کہا جاتا ہے، اب ایک باقاعدہ علمی ڈسپلن کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اس کے لیے اردو میں 'نشانیات' اور 'سیمیات' کی اصطلاحیں برتی جاتی ہیں۔ نشانیات اس لیے کہ اس ڈسپلن میں کائناتی مظاہر اور اشیا، جذبات، اصطلاحات، جذبات، احساسات اور گفتگو کو نشانات میں تقسیم کر کے مطالعہ کیا جات ہے۔ جب کہ سیمیات کی وجہ تسمیہ ایک تو اصل اصطلاح سے صوتی تعلق ہے دوسرا نشانیات کی اصطلاح سیماٹکس کی جہات اور حدود کا مکمل احاطہ کرنے سے قاصر ہے، اس لیے سیمیات کی اصطلاح ہی قرین انصاف نظر آتی ہے۔ سیمیات چونکہ ثقافتی، لسانی، ذہنی نشانات اور علامات کا علم ہے، اس لیے اس تنقیدی فکر میں ابلاغ کی ہر ممکنہ جہت سے مکالمے کی صلاحیت موجود ہے۔ سیمیات کا علم ہمیں ایک

ایسا دائرہ کار فراہم کرتا ہے جس کے ذریعے انسانی ذرائع ابلاغ، حدود اور جہاتِ ابلاغ کا احاطہ کیا جا سکتا ہے۔ یہیں علمیات، ادبیات، جمالیات اور شعریات سے متعلق ہر متن کو لسانی اور ثقافتی سرگرمیوں کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ یہ سرگرمیاں ہوں یا کسی بھی علم اور منطقے سے جڑے کسی بھی نوعیت کی علامتیں، ان سب کی تفہیم و تعبیر کے لیے انھیں لسانی اکائیوں کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ سیمیاتی مطالعات کی بنیادوں میں اگرچہ ساختیاتی اور پسِ ساختیاتی مفکرین کی کاوشیں شامل ہیں لیکن اس فکر کی ترویج میں تانیثی، نومارکسی اور مابعد جدید مفکرین کی خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

سیمیات میں متن کی تفہیم و تعبیر اور معنیاتی ماٰخذ تک رسائی کے لیے زبان اور زبان سے منسلک ثقافت کو مرکز تسلیم کر کے مطالعہ کیا جاتا ہے۔ کسی بھی خطے میں، کسی بھی زبان کی گرامر کے تحت جب کوئی جملہ تشکیل دیا جاتا ہے تو وہ وہاں کی انسانی و سماجی سرگرمی اور ان کی آپسی نوعیت کا عکاس ہوتا ہے۔ کسی جملے میں فاعل کون ہے مفعول کون اور فعل ہے کیا؟ فاعل فاعل کیوں ہے اور مفعول مفعول کیوں؟ ان کی لسانی و سماجی معنویت کیا ہے اور ان سے معنی کس بنیاد پر اخذ کیے جاتے ہیں، ان سب کے سیمیاتی و ساختیاتی مطالعے کے لیے بیانیاتی ماڈل تجویز کیے گئے ہیں جو متن کی ہیئت، ساخت اور نوعیت جانچنے کے بعد موزوں تنقیدی زاویے تجویز کرتے ہیں جن کا بنیادی تعلق معنی کی پیداوار سے ہے۔ یعنی اخذِ معنی کا مطالعہ اور یہ مطالعہ کہ معانی لسانی ساختوں کے آپسی رشتوں اور انسلاک سے پیدا ہوتے ہیں یا ان لسانی رشتوں کے پیچھے انسان کا شعوری یا لاشعوری عمل بھی موجود ہے، یعنی سیمیاتی مطالعات متن، سیاق اور تناظر کو مناسب اہمیت دے کر ہی تفہیم و تعبیر کا عمل ممکن بناتے ہیں۔

فرڈی نینڈ ڈی سوسیئر [Ferdinand De Saussure] ہی سیمیات کے بنیاد گزار ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے زبان کو نشانات کا نظام قرار دیا تھا۔ جس میں انھوں نشان کو سگنی فائر اور سگنی فائیڈ میں منقسم کر کے تفہیم کی راہ سجھائی تھی۔ سگنی فائیڈ یعنی دال یعنی معانی نما اور سگنی فائیڈ یعنی مدلول یعنی تصور معنی کا آپسی تعلق انھوں نے الل ٹپ یا من مانا قرار دیا تھا، جس کی بنیاد رسوم، روایت یا ثقافت ہے۔ ایک اور نکتہ جو سوسیئر ہی نے سجھایا تھا وہ یہ کہ کسی بھی نشان سے جڑا معنی سمجھنے کے لیے اس بات پر غور کرنے کی بجائے کہ وہ کیا ہے، اس بات پر غور کرنا پڑے گا کہ وہ کیا نہیں ہے۔ کسی نشان کا بذاتہٖ کوئی معنی نہیں ہوتا بلکہ دوسرے نشانات سے جڑ کر اس میں معنی خیزی پیدا ہوتی ہے۔ کوئی نشان اپنے سیاق اور تناظر کے ساتھ ہی صحیح تصور کا ابلاغ کر سکتا ہے۔(۲۴)

امریکی ماہرِ سیمیات چارلس ولیم مورس[Charles Willian Morris] (۱۹۰۱ـ۱۹۷۹ء) نے اپنی کتاب Sign Language and Behaviour(۱۹۴۶ء) لکھ کر سیمیات کی جہت متعین کی۔ اس کتاب میں انھوں نے اشیا فرد اور نشانات کا مطالعہ کیا اور ان سب اور ان کے مطالعے میں سماجی عمل کو بے حد اہمیت دی۔ یوں سماجی اور سماجی عمل کو معنی خیزی کے عمل میں اہمیت حاصل ہوئی۔

امریکی فلسفی چارلس سینڈر پیئرس(Charles Sander Peirce) نے اپنی کتاب Theory of Semiotics(۱۹۷۵ء) میں سیمیات کو نشانات کی ڈاکٹرائن قرار دیا۔ لکھتے ہیں:

> "Semiotics, so understood, is defined as the analytical study of the essential conditions to which all signs are subject." (25)

پیئرس کے نزدیک حقیقت کے درست ادراک کے لیے نشانات کے وجود میں آنے کے نظام اور اس کے طریقۂ تعبیر سے واقفیت لازم ہے۔ سیمیات میں نشانات، ان کے وقوع کا نظام اور ان سے معنی خیزی کے اصول کو واضح کیا جاتا ہے۔ پیئرس تین قسم کی نشانات کو ابلاغ کے لیے ضروری خیال کرتا ہے۔

Iconic: اس میں نشان اس معروض کے مماثل ہوتا ہے جس کی وہ نمائندگی کرتا ہے، جیسے کسی فرد کی تصویر اسی کی طرح ہی ہو گی۔

Indexical: یہاں نشان کا اس شے سے انسلاک نظر آتا ہے جس کے لیے وہ برتا جاتا ہے، جیسے دھوئیں سے آگ اور چہرے کی لالی سے حیا کی طرف دھیان جاتا ہے۔

Symbolic: جب کسی نشان کو کسی ایسی شے کے لیے پیش کیا جاتا ہے جس سے اسے کوئی ظاہری مماثلت نہ ہو۔ جیسے اشیا کا وجود اور ان کے نام۔(۲۶)

معروف اطالوی ماہر لسانیات امبرٹو ایکو(۱۹۳۲ـ۲۰۱۶ء Umberto Eco)نے A Theory of Semiotics لکھ کر سیمیات کے میدان میں قابلِ قدر اضافہ کیا۔ انھوں لسانیات، سیمیات اور جمالیات سے تشبیہ، استعارہ، علامت اور رمز کا تعلق واضح کیا اور ان کی تفاعل سے معنی کی تشکیل کو واضح کیا۔

جب لسانیات کا رشتہ تخلیقی زبان سے جوڑ کر دیکھیں تو ہمیں سیمیات اور شعریات کی سرحدیں ملتی نظر آتی ہیں، انھیں جوڑنے والی Systemetic Linguisticsیا Functional Grammer کی تھیوری ہے جہاں تخلیقی متن اور لسانی رشتوں کے حوالے سے توازن دیکھنے کو ملتا ہے۔ Functional Grammer کی تھیوری کے بنیاد گزار مائیکل ہالیڈے(۱۹۲۵ـ۲۰۱۸ء Michael Halliday) ہیں۔

اس تھیوری میں زبان کو محض زبان نہیں سمجھا جاتا بلکہ اسے ایک فعال نظام میں کام کرنے والی معاشرتی سرگرمی سمجھا جاتا ہے جس کا تعلق متن کی داخلی سرگرمیوں سے بھی ہے اور متن سے باہر سیاق اور تناظر سے بھی؛یعنی لسانیات سے متعلق اس تھیوری کی اہم بات یہ ہے کہ اس میں سیاق کو بھی قابلِ غور سمجھا گیا ہے، بلکہ یوں کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ ہالیڈے لسانی اکائیوں کو ثقافتی اظہاریے ہی سمجھتا ہے۔یعنی متن کے ابلاغ کے لیے ثقافت سے واقفیت لازم ہے۔(۲۷)

ہالیڈے کے نزدیک سیاق کی تشکیل تین سطحوں پر ہوتی ہے:

ا۔Field:وہ موضوع جس کے حوالے سے متن تخلیق ہو۔

ب۔Tenor: وہ کردار جو، مکالمے یا تحریر میں شامل ہوں۔

ج۔Modes: ذریعہ ابلاغ کی نوعیت یعنی کی ماہیت، اسلوب اور طرز نگارش۔

اس کے علاوہ یہ تھیوری تین قسم کے لسانی افعال و اعمال، جو ابلاغ میں حصہ ڈالتے ہیں، کو موضوع بناتی ہے۔

ا۔ تجربی اعمال(Ideational Functions): انسان اپنی زبان یا زبان کی اکائیوں کا انتخاب اپنے تجربات کی بنیاد پر کرتا ہے۔ایک انسان جب کسی عمل یا تجربے سے گزرتا ہے تو اسی وقت پیش آنے والی زبان ہی کو اس کے اظہار کے لیے مناسب خیال کرتا ہے، پھر جب کبھی بھی اسی تجربے کا اظہار مقصود ہو انسان اسی مخصوص زبان میں اظہار کرتا ہے۔

ب۔باہمی اعمال(Interpersonal Functions):دو افراد کی آپسی گفتگو ان کے باہمی رشتے، مقام و مرتبے اور اس کی سماجی حیثیت کے مطابق ہوتی ہے۔مکالمے میں موجود فرد یا اس کی حیثیت کے بدلنے سے زبان کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے۔

ج۔متنی اعمال(Textual Functions):وہ متنی عمل یا لسانی رشتے جن کی بنا پر معنی طے پاتے ہیں اور ابلاغ ممکن ہوتا ہے، ابلاغی عمل میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

مائیکل ہالیڈے کی اس لسانی تھیوری کا اطلاق سماجی مظاہر کے علاوہ ادبی متون پر بھی ہو چکا ہے۔ ادبی متون کی قرأت کے دوران میں سیاق، تناظر اور ثقافتی عمل کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔(۲۸)

زبان کا تعلق کسی بھی ثقافت سے بہت گہرا ہوتا ہے۔زبان کی صرفی و لغوی بنت ہو یا ثقافت کی

تشکیل اور تعبیر؛ یہ آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ یہ لسانی یا ساختیاتی اکائیاں ہمہ قسم کے اصولوں کی بنیاد پر جڑی ہوتی ہیں۔ تخلیقی متون میں تنوع اور ان کے معانی میں رنگارنگی دراصل انھی ہمہ گیر ساختیاتی اصولوں کی بنیاد پر ظاہر ہوتی ہے جن کی تعبیر دراصل انھی اصولوں کی شناخت سے ممکن ہو پاتی ہے۔ یہیں پر ساختیات اور سیمیات یکجا ہوتے نظر آتے ہیں۔ Kate McGowan ان نشانات اور ان کے ثقافتی رشتوں کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

> "Semiotics is concerned with signs. Aa an academic disciplain, semiotics is primarily concerned with the life of signs with their production as an effect of signifying system, right through the particular implications of the significations they can be said to carry within the cultural systems in which they operate." (29)

سیمیات معنی تک رسائی کے لیے تفہیمِ متن کی تکون یعنی مصنف، متن اور قاری، بوقتِ ضرورت ہر پہلو کو پیشِ نظر رکھنے کی قائل ہے۔ اگر کوئی معبر ان تمام عناصر کا خیال رکھتے ہوئے، متن کے تمام زاویوں کو پیشِ نظر رکھ کر تعبیر نہیں کرتا اور متن سیاق اور تناظر سے متعلق بغیر کوئی جواز فراہم کیے نئی بات کرتا ہے تو اس کی من مانی تعبیر قابلِ قبول نہیں ہو گی۔ اردو تنقید کی روایت میں کئی ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں متن کو سیاق و سباق سے جوڑ کر تعبیر کی کوشش کی گئی ہے۔ میر تقی میر کو اس کے عہد میں رکھ کر پرکھنے کی کوشش ہو یا غالب کو اس کے معاشی حالت کی آئینہ میں دیکھنے کی، اسی طرح فیض کے ہر شعر کو ترقی پسندی کے پیشِ نظر رکھ کر تعبیر کرنے کی مثالیں بھی سامنے ہیں، یہ سب مصنف کو مرکز مان کر اس کے متن کی تعبیرات ہیں۔ تاہم ایسی بھی کئی کوششیں موجود ہیں جن میں متن کو اساس مان کر اسی کی بنیاد پر معنی اخذ کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ تاہم ہر نوعیت کی تعبیر اس وقت مشکوک قرار پاتی ہے جب معبر "شاعر کہتا ہے" کہہ کر بات آگے بڑھاتا ہے۔

تعبیرِ متن کے حوالے سے ایک بات واضح ہونی چاہیے کہ معنیات اور سیمیات کسی اصل، حقیقی یا خالص معنی کی دریافت کی داعی نہیں ہے بلکہ یہ کسی بھی متن میں موجود تمام معانی کھوج کر سامنے لانے میں کوشاں رہتی ہے۔ جو معبر متن ہی کو اہمیت دے گا وہ خارجی مظاہر اور سیاق کو نسبتاً نظر انداز کر دے گا۔ اسی طرح تاریخ و ثقافت کو تناظر کے طور پر برت کر دیکھنے والا معبر حتیٰ المقدور متن کا رشتہ خارج سے جوڑے گا، تاہم اس عمل کے لیے تمام تر امکانات متن ہی فراہم کرتا ہے۔ تعبیری عمل آزاد ہے، اس میں اگر کسی متن

میں فلسفیانہ یا سیاسی معنی کو بلاجواز کہنا مقصود ہے تو اس کے لیے یہ ثابت کرنا ضروری نہیں کہ مصنف نے یہ معانی مراد نہیں لیے بلکہ ثابت کرنا چاہیے کہ متن ان معانی کا متحمل نہیں ہو سکتا، یعنی اب یہ متن پر ہے کہ تعبیر کے عمل میں کتنے تناظرات کا ساتھ دے سکتا ہے یا اس کے ساتھ جڑ کر کتنے تناظرات بے تعلق ہو جاتے ہیں۔

معاصر تنقیدی منظر نامے میں ساختیات، پسِ ساختیات، تانیثیت، نو تاریخیت اور ماحولیات ایسے نظریات کو تناظر کے طور تخلیقی متون پر اطلاق کر کے تعبیرات پیش کرنے کی روِش عام ہے۔ یہ نظریات اپنے ساتھ اطلاقی پیمانے اور طریق بھی ساتھ لائے ہیں لہٰذا قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان سے متعلق تعبیرات درست منہاجیات کی حامل ہوں گی تاہم تشکیک و تجسس کو بنیاد بنا کر سوچیں تو کئی سوالات سامنے آتے ہیں؛ اردو میں جدید و مابعد جدید تنقیدی تناظرات کو برت کر ادب پاروں کی جو تعبیر کی گئی ہے وہ علم المعانی، معنیات یا سیمیات کے اصولوں سے کس حد تک ہم آہنگ ہیں اور اس میں نظری و عقلی جواز کس حد تک کارفرما ہے؟ اسی طرح اردو میں جدید و مابعد جدید تنقید کے رواج پانے سے قبل جتنی تشریحات و تعبیرات موجود ہیں ان کی بنیاد کس نظریے پر ہے؟ ان میں سیمیاتی اور ہر مینیاتی اصولوں کا التزام موجود ہے یا بس لغت ہی کو اصول بنا کر تعبیرات کی گئی ہیں؟ قدماء کے ذہن میں التواو کثرتِ معنی کا کون سا تصور موجود تھا جس کی بنیاد پر مختلف ادبی متون کی کثرتِ تعبیر سامنے آئیں؟ یقیناً پیش کیے گئے مباحث اور ان کی بنیاد پر اُٹھائے جانے والے یہ سوالات اردو کے تعبیری ذخیرے پر نظرِ ثانی پر مجبور کرتے ہیں کہ اور یہ ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ اردو تنقید کا اپنا معنیاتی و تعبیری نظام ہو جو بہر طور مقامی فکر، ثقافت اور مزاج سے لگا کھاتا ہو۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(1) *New Lexican Webster Dictionary of The English Language*, (New York: Lexican Publications: 1989), 906

(2) Bussmann, Hadumod, *Dictionary of Language and Linguistics*, (Edi.&Trans.) Gregory P. Trauth and Kerstin Kazzazi, (London: Routledge, 2006), 1053

(۳) ریاض احمد، ”علمِ معانی و بیان“، مشمولہ: تنقید کی جمالیات، جلد ہشتم، (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۸ء)، ۱۳۔

(۴) عبدالمجید، جامع اللغات، (لاہور: ملک دین محمد اینڈ سنز۔ س۔ن)، ۴۴۔

(۵) عبدالرحمٰن، مراۃ الشعر، (لکھنؤ: اترپردیش اردو اکادمی، ۱۹۷۸ء)، ۹۷۔

(۶) ساجد اللہ تفہیمی، فرہنگِ اصطلاحات علومِ ادبی، (اسلام آباد، مرکز تحقیقاتِ فارسی، ایران و پاکستان، ۱۹۹۶ء)، ۳۰۲۔

(۷) نجم الغنی رام پوری، بحرالفصاحت، جلد اوّل، تدوین: ڈاکٹر احمد کمال صدیقی، (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو، ۲۰۰۶ء)، ۵۳۹۔

(۸) مولوی مہدی الزماں، شعر و شاعری، (الٰہ آباد، ماہنامہ خیابان، ۱۹۴۱ء)، ۴۳۔

(۹) مزمل حسین، اردو میں علمِ بیان اور علمِ بدیع کے مباحث، (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۲۰ء)، ۱۴۔

(۱۰) عبدالحمید تحسین بدایونی، فصاحت و بلاغت، (بدایوں: وکٹوریہ پریس، ۱۹۱۳ء)، ۱۱، ۱۰۔

(۱۱) وارث سرہندی، قاموس المترادفات، (لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۱۹۸۶ء)، ۲۱۹۔

(۱۲) عبدالرحمٰن، مراۃ الشعر، ۵۸۔

(۱۳) عامر سہیل، جدید لسانیاتی اور اسلوبیاتی تصورات، ۲۱۵۔

(۱۴) الٰہی بخش اختر اعوان، کشاف اصطلاحات لسانیات، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۵ء)، ۴۱۷۔

(۱۵) ڈاکٹر اشرف کمال، لسانیات اور زبان کی تشکیل، (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۵ء)، ۱۵۹۔

(۱۶) رؤف پاریکھ، لسانیات کے بنیادی مباحث، (کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۲۱ء)، ۷۰۔

(17) Patrick grifh, *Itroduction to English Semantics and Pragmatics*, (Adumbra: Adumbra University Press, 2006),1.

(18) Katie Wales, *A Dictionary of Stylistics*, (London: Routledge, 2011), 277

(19) Victoria Fromkin, *An Intriduction to Language*, (MelbournL: Thomas Publishng, 2005), 334

(۲۰) رؤف پاریکھ، لسانیات کے بنیادی مباحث، ۷۴۔

(۲۱) گیان چند جین، عام لسانیات، (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، بھارت، ۲۰۰۳ء)، ۲۹۵۔

(22) Colourlesss green ideas sleep furiously.

رؤف پاریکھ، لسانیات کے بنیادی مباحث، ۷۹

(۲۳) ایضاً، ۸۹۔

(24) Koerner, Ernst Fryderyk Konrad, *Ferdinand De Saussure; Origin and Development of His Linguistics Theory in Western Studies of Language*, (Downtown Vancouver: Simon Frases University, 1971),21

(25) Lizka, James Jakob, *A Genral Introduction to Semiotics of Charles Sander Peirce*, (Indiana: Indiana University Press, 1996), 382.

(۲۶) سہیل احمد خان، منتخب ادبی اصطلاحات ،(لاہور: شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، ۲۰۰۵ء)، ۱۸۲۔

(27) Halliday, M.A.K. An Introduction to Finctional Grammar, (London: Hodder Arnold, 2004), 248.

۲۸۔ فرخ ندیم،" سیمیات اور شعریات، ایک بیانوی نظم کا تجزیہ"، مشمولہ دریافت، ۲۲،(اسلام آباد: شعبۂ اردو، نمل یونی ورسٹی،۲۰۱۹ء)،۵۳۔

(29) Malpas and Paul Wake, The Routledge Companion to Critical Theory,(London: Routledge, 2006), 324.

BIBLIOGRAPHY

- Abdul Majeed, *Jāmiʿa-ul-Lughāt*, (Lahore: Malik Deen Muhammad and Sons, s.n.)
- Abdul Rahman, *Marāqāt-ush-Shuʿarāʾ*, (Lucknow: Uttar Pradesh Urdu Academy, 1978)
- Akhtar, Elahi Bakhsh, *Kashāf-e-Iṣṭilāḥāt-e-Lisāniyāt*, (Islamabad: Muqtadra Qaumi Zaban, 1995)
- Ashraf Kamal, Dr., *Lisāniyāt aur Zabān kī Tashkīl*, (Faisalabad: Misal Publishers, 2015)
- Badayuni, Abdul Hameed Tahseen, Maulana, Hakeem, *Faṣāḥat o Balāghat*, (Badayun: Victoria Press, 1913)
- Bussmann, Hadumod, *Dictionary of Language and Linguistics*, Edited and translated by Gregory P. Trauth and Kerstin Kazzazi, (London: Routledge, 2006)
- Gyan Chand Jain, *ʿĀm Lisāniyāt*, (New Delhi: National Council For Promotion Of Urdu Language, India, 2003)
- Halliday, M.A.K., *An Introduction to Functional Grammar*, (London: Hodder Arnold, 2004)
- Katie Wales, *A Dictionary of Stylistics*, (London: Routledge, 2011)
- Koerner, Ernst Fryderyk Konrad, Ferdinand De Saussure; Origin and Development of His Linguistics Theory in Western Studies of Language, (Simon Fraser University, 1971)
- Lizka, James Jakob, *A General Introduction to Semiotics of Charles Sander Peirce*, (Indiana: Indiana University Press, 1996)
- Mehdi-ul-Zaman, Maulvi, Syed, *Sheʿr o Shaʿirī*, (Allahabad: Mahnama Khiyaban, 1941)
- Muzammil Hussain, *Urdū mein ʿIlm-e-Bayān aur ʿIlm-e-Badīʿ ke Mabāḥis*, (Lahore: Fiction House, 2020)

- Najm-ul-Ghani Rampuri, Hakeem, *Baḥr-ul-Faṣāḥat*, Jild Awwal, (Edi) Dr. Ahmed Kamal Siddiqui, (New Delhi: National Council For Promotion Of Urdu Language, India, 2006)
- Patrick Grifh, *Introduction to English Semantics and Pragmatics*, (Adumbra: Adumbra University Press, 2006)
- Rauf Parekh, Dr., *Lisāniyāt ke Buniyādī Mabāḥis*, (Karachi: City Book Point, 2021)
- Riaz Ahmed, *ʿIlm-e-Maʿānī o Bayān*, Mashmūlah Tanqīd kī Jamāliyāt, Jild Hashtam, (Lahore: Fiction House, 2018)
- Sajid Ullah Tafheemi, Dr., *Farhang-e-Iṣṭilāḥāt-e-ʿUlūm-e-Adabī*, (Islamabad: Centre for Persian Research, Iran and Pakistan, 1996)
- Simon Malpas and Paul Wake, *The Routledge Companion to Critical Theory*, (London: Routledge, 2006)
- Suhail Ahmed Khan, Dr., *Muntak̲h̲ab Adabī Iṣṭilāḥāt*, (Lahore: Deparment for Urdu, Government College University, 2005)
- *The New Lexican Webster Dictionary of The English Language*, (New York: Lexican Publications, 1989)
- Victoria Fromkin, *An Introduction to Language*, (Melbourne: Thomas Publishing, 2005)
- Waris Sirhindi, *Qāmūs-ul-Mutarādifāt*, (Lahore: Urdu Science Board, 1986)

❖❖❖